رسائل و مسائل

نباتات و حشرات کی موت و حیات

(ابو الاعلیٰ مودودی)

سوال - مندرجہ ذیل دو امور آپ کی خاص توجہ کے مستحق ہیں ۔ امید ہے کہ ان پر آپ کے غور و خوض سے میری الجھن دور اور دیگر قارئین تفہیم القرآن کے علم میں اضافہ ہو گا :

(۱) سورہ والنحل صفحہ ۵۵۰ پر آیت ۶۵ کا آپ نے مندرجۂ ذیل ترجمہ کیا ہے : "(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو) کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی ۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لیے ۔" اس آیت کی تفسیر میں حاشیہ ۵۳ پر آپ نے جو تحریر فرمایا، اس کا اختصار حسبِ ذیل ہے : "پچھلی برسات کے بعد جو نباتات مر چکی تھی، یا بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گرمی کے زمانے میں باقی نہ رہا تھا (یعنی مر چکے تھے) یکایک پھر اسی شان سے نمودار ہو گئے (یعنی دوبارہ زندہ ہو گئے) پھر بھی تمہیں نبیؐ کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا ۔"

زندگی بعد الموت کی یہ مثال بالکل خلافِ حقیقت و مشاہدہ ہے ۔ کوئی پیڑ یا پودا مکمل طبعی موت کے بعد زندہ نہیں ہوتا، چاہے کتنی ہی برساتیں گذر جائیں ۔ صرف وہ جڑیں پھوٹتی ہیں جن میں زندگی کی کچھ رمق باقی رہتی ہے ۔ دوم کیڑے مکوڑے گرمیوں میں یقیناً مر جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عرصہ دراز تک بے حس و حرکت (HYBRNATED) پڑے رہتے ہیں یا انڈے، لاروا، پیوپا کی صورت میں زمین، لکڑیوں، درازوں، سوراخوں، پانی وغیرہ کسی جگہ پر موجود رہتے ہیں اور مناسب درجۂ حرارت و رطوبت اور موافق موسم کے آتے ہی اپنے اپنے خول سے نکل آتے ہیں ۔ مکھی، مچھر، پھنگے

کھٹمل اور زمین کے تمام حشرات الارض کے مختلف ادوارِ زندگی ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے ہر خطے کی آب و ہوا کے مطابق وہ درجات مختلف اوقات میں پایۂ تکمیل پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ مثال کہ نباتات یا حشرات الارض موت کے بعد دنیا ہی میں دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں، قطعی خلافِ حقیقت ہے۔

اس تفسیر کو قلم بند کرنے سے پہلے اگر آپ علم نباتات (BOTANY) اور علم الحشرات (ENTOMOLOGY) کے کسی عالم یا متعلم سے مشورہ کر لیتے یا ان کے متعلق کوئی کتاب ہی مطالعہ فرما لیتے تو ایسے اہم موضوع پر اتنی عام غلطی نہ سرزد ہوتی۔ ایسی پُرمغز اور عظیم تفسیر میں ایسی خلافِ سائنس یا خلافِ حقیقت و مشاہدہ بات پڑھ کر وہ لوگ جن کو آپ سے عقیدت نہیں ہے یا جو آپ کی عظمت کے قائل اور علمیت سے واقف نہیں ہیں بقیہ مضامین کو بھی اس پیمانے پر ناپیں گے۔

میں یہ گزارشات اپنے محدود علم اور ایک ماہر حشرات الارض سے مشورہ کرنے کے بعد لکھ رہا ہوں۔

(۲) تفہیم القرآن۔ سورہ الاعراف حاشیہ ۸۷ کی مندرجۂ ذیل سطر قابلِ توجہ ہے:

"خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔" مندرجۂ بالا جملہ میں عجیب یا غیر عجیب کی بحث سے قطع نظر، میری گزارش صرف یہ ہے کہ جس انڈے سے کوئی جاندار شے پیدا ہوتی ہے مثلاً اژدہا، مچھلی، چھپکلی، مرغی، کبوتر وغیرہ اس انڈے کے اندر مادہ، بے جان نہیں ہوتا، بلکہ قطعی جاندار ہوتا ہے۔ یعنی اس انڈے میں نر و مادہ کے تولید کا مجموعہ (OVUM + SPERM) موجود ہوتا ہے۔ بے جان مادّے والا انڈا وہ ہوتا ہے جو مادہ، بغیر نر کے دیتی ہے اور اس کو عرفِ عام میں خاکی انڈا کہتے ہیں اور جس میں سے کسی طرح بھی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کے باعث تو آپ کی دلیل مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قوتِ معجزہ کو غلط سائنٹفک استدلال سے ثابت کرنا اور بھی عجیب ہو جاتا ہے۔"

جواب: آپ نے میری تصحیح کی جو کوشش فرمائی ہے اس کے لیے شکر گزار ہوں۔

جہاں تک سورۂ نحل والی آیت کا تعلق ہے اس میں استدلال اُس عام منظر سے ہے جو ہر دیکھنے والا برسات کے موسم میں دیکھتا ہے۔ اسی عام مشاہدے کی تشریح میں نے کی ہے۔ میرے اصل الفاظ یہ ہیں:

"یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھونس ہے نہ بیل بوٹے، نہ پھول پتی اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آگیا۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکایک جی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہوگئی جو پچھلی برسات میں پیدا ہونے کے بعد مر چکی تھی۔ بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گرمی کے زمانے میں باقی نہ رہا تھا، یکایک پھر اُسی شان سے نمودار ہو گئے جیسے پچھلی برسات میں دیکھے گئے تھے . . . . "

رہا بیالوجی اور علم نباتات اور علم حشرات کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کا گہرا جائزہ، تو اس کے متعلق آپ کے مشورے کے مطابق میں انشاءاللہ دوسرے ماہرین سے بھی پوچھوں گا، اور آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ خود اپنی معلومات اور اپنے اہلِ علم احباب کی رائے اس پہلو سے مجھے بتائیں کہ گھاس کی جڑوں اور حشرات الارض کے متعلق یہ خیال کہ "طبعی موت کے بعد ان کا بارش میں جی اٹھنا ممکن نہیں ہے، اور صرف وہی جڑیں اور حشرات دوبارہ زندہ ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نہ کسی شکل میں حیات کی رمق باقی ہو" آیا یہ تجربے اور علمی مشاہدے پر مبنی ہے یا اس قیاس پر کہ بہر حال طبعی موت کے بعد کسی چیز کا جی اٹھنا تو غیر ممکن ہے اس لیے جو چیز بھی بارش میں زندگی لیے ہوئے نمودار ہوتی ہے وہ ضرور اپنے اندر کچھ حیات لیے ہوئے سو رہی ہوگی؟

صحرائے عرب کا وہ حصہ جس کو الربع الخالی کہتے ہیں، بسا اوقات دس دس سال تک بارش سے بالکل محروم رہتا ہے، اور گرمی کے موسم میں درجۂ حرارت وہاں ۱۲۴ سے ۱۴۰ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس پر بھی جب وہاں بارش ہوتی ہے تو صحرا کی ریت پر گھاس اُگ آتی ہے اور حشرات الارض رینگنے لگتے ہیں۔ یہ بات اس علاقے کے متعدد سیاحوں نے بیان کی ہے۔ ۱۹۵۹ء کے آخر میں جب میں عرب کا سفر کرتا ہوا تبوک پہنچا تو اتفاق سے اسی روز بارش ہو گئی۔ وہاں کے گورنر اور قاضی نے مجھے بتایا کہ یہ بارش پورے پانچ سال بعد ہوئی ہے۔ اس کے بعد جب میں تبوک سے واپس روانہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہی صحرا جسے آتے ہوئے میں نے راستے میں بالکل سُونا دیکھا تھا، اب

اس پر گھاس اگی ہوتی ہے۔ گاڑی سے اتر کر حشرات الارض کو تلاش کرنے کا مجھے خیال نہیں آیا۔ لیکن گھاس تو میرے سامنے موجود تھی۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ محض مفروضہ ہے کہ ۵-۱۰ سال تک جڑیں کسی نہ کسی درجہ کی حیات لیے ہوئے اندر ضرور موجود ہوں گی جو بارش میں تازہ ہوگئیں یا فی الواقعہ ایسا کوئی تجربہ و مشاہدہ ہوا ہے کہ جو جڑیں بارش میں زندہ ہوگئیں وہ وہی تھیں جن میں اس نوعیت کی حیات باقی تھی؟ نیز کیا درحقیقت جڑوں کی طبعی موت اور کسی درجہ کی حیات کے درمیان کوئی قطعی خطِ امتیاز سائنس میں معلوم کیا جا سکا ہے؟

یہی سوال حشرات الارض کے بارے میں بھی ہے کہ صحرا کی ریت میں طویل مدت کی خشک سالی اور شدید گرمی کے بعد جو حشرات بارش کے بعد نمودار ہو جاتے ہیں، آیا ان کے بارے میں یہ تحقیق کیا جا چکا ہے کہ وہ بارش سے پہلے کسی نوعیت کی زندگی لیے ہوئے محض سو رہے تھے یا یہ محض ایک قیاسی مفروضہ ہے؟ ان امور پر اگر آپ کچھ روشنی ڈالیں تو میں تفہیم القرآن میں اس مضمون کے تمام حواشی پر تحقیق کے ساتھ نظرِ ثانی کر سکوں گا۔ اس مسئلے پر اچھی طرح تحقیق ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ بعض نباتات و حیوانات میں اللہ تعالیٰ نے اعادۂ خلق اسی دنیا کے اندر رکھا ہے تاکہ حیات بعد موت کی نشانی بن سکے۔ اسی وجہ سے قرآن میں جگہ جگہ بارش کے اثر سے مردہ زمین کے جی اٹھنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اسے حیات بعد موت کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

لاٹھی سے اژدہا بننے کے معجزے پر جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی پھر وضاحت کیے دیتا ہوں۔ ایک بارور شدہ FERTILISED انڈے کے اندر جو مذکر و مؤنث مادۂ تولید زندگی لیے ہوتے موجود ہوتا ہے، وہ بھی ایک مادی پیکر ہی ہوتا ہے جس میں زندگی خدا کی ڈالی ہوئی ہوتی ہے، ورنہ وہ مادہ جس سے اس کا جسم بنا ہوا ہوتا ہے بجائے خود اپنے اندر کوئی حیات نہیں رکھتا۔ اب فرق جو کچھ بھی ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ اژدہوں کی عام پیدائش ان انڈوں سے ہوتی ہے جن کے اندر ابتداءً زندگی نر اور مادہ کے اتصال سے مادی پیکر میں پیدا کی جاتی ہے، اور پھر اسے بتدریج نشو و نما دے کر اژدہا بنایا جاتا ہے۔ مگر معجزے سے لاٹھی کا جو اژدہا بنا، اس میں لاٹھی کے مادی پیکر میں خدا نے براہِ راست اژدہے والی حیات پیدا کر دی اور اسے اژدہے کی صورت بھی عطا کر دی۔ میرا استدلال یہ ہے کہ لاٹھی سے براہ راست اژدہا بننا صرف اس بنا پر معجزہ ہے کہ یہ واقعہ عام معمول سے ہٹ کر پیش آیا ورنہ اس مادۂ ذکر و انثیٰ OVUM + SPERM سے جو اژدہا پیدا ہوتا ہے وہ

بھی معجزہ ہی ہے۔ اس کے معجزہ ہونے کا تصور ہمارے ذہن میں نہ آنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اسے عام معمول سمجھتے ہیں۔

مضاربت کی ایک صورت اور اس کے احکام

(ملک غلام علی صاحب)

سوال: فقہاء کا یہ فیصلہ ہے کہ مضاربت میں اگر عامل بھی اپنا سرمایہ لگائے تو اس پر سارا نفع اسی کو ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رب المال کے سرمایہ سے تجارت کر کے اس کے نفع میں بھی اپنا حصہ بٹائے گا۔ اس سلسلہ میں بعض اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ براہِ کرم ان پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

مثلاً زید کے ایک ہزار روپے سے دواؤں کی ایک دکان شروع کی گئی۔ اس رقم میں صرف چار کمپنیوں کی دوائیں آسکتی ہیں اور اتنی فروخت ہوتی ہیں کہ سرمایہ پر ۲۰ فیصد نفع حاصل ہو۔ البتہ اگر عمرو کے دو سو روپے سے پانچویں کمپنی کی دواؤں کا میل ملا لیا جائے تو منافع کی شرح ۳۵ فیصد ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ۱۵ فیصد اضافہ مجرد دو صد روپے کے اضافے سے نہیں ہوا۔ بلکہ ہزار کو بارہ سو کرنے سے ہوا۔ ورنہ اگر صرف دو سو روپے سے دواؤں کا کاروبار کھولا جاتا تو ممکن ہے شرح منافع پانچ فیصد سے زیادہ نہ ہوتی۔ کیونکہ کم اسٹاک اور میل کی عدم موجودگی کی وجہ سے خریداروں کا رجوع کم ہوتا۔

ایک اور شکل لیجیے۔ عمرو نے خریداری کا سارا کاروبار زید کے ہزار روپیہ کے سرمایہ سے کیا اور اپنے دو سو روپے اشتہاری مصرف میں لایا۔ جس سے مال کی کھپت فوری ہو گئی۔ روپے کا ہیر پھیر بسرعت ہو گیا اور آگے چل کر شرح منافع بہت زیادہ ہو گئی۔ اگر اشتہار پر رقم خرچ نہ ہوتی تو تجارت کا رنگ برعکس ہوتا۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے حالات میں تجارت میں سرمایہ بڑھنے سے اس کی استعدادِ نمو اور اس کی شرح میں نسبتاً اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہر حصہ علیحدہ علیحدہ استعمال کیا جائے تو یہ شرح بڑھنے کے بجائے بہت کم رہ جاتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی ایسی صورت میں عامل کو اس کے سرمایہ پر منافع کا تنہا حقدار قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ فقہائے کرام کا فیصلہ علی الاطلاق نہ ہو بلکہ اس زمانے کے خاص تجارتی حالات کے تابع ہو۔

ایک مزید اشکال یہ ہے کہ عامل جب اپنا سرمایہ بھی شامل کر دے گا تو اگر دونوں سرمایوں سے خریدکردہ مال قابلِ غلط نہیں ہے تو ممکن ہے کہ اس کے مال کی حد تک دلچسپیاں رب المال کے مال سے کم ہو جائیں اور اس طرح رب المال کا تجارتی مفاد مجروح ہو۔ اس لیے استحساناً یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عامل کے سرمایہ کے نفع سے رب المال بھی حصہ پائے۔

جواب: آپ نے اپنے استفسار میں لکھا ہے کہ فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ مضاربت میں اگر عامل اپنا سرمایہ لگائے، تو اس کا سارا نفع عامل کو ملے گا اور اس کے ساتھ وہ رب المال کے سرمائے سے تجارت کر کے اس کے نفع سے بھی اپنا حصہ بٹائے گا۔ اس فیصلے کو بنیاد بنا کر آپ نے متعدد اشکالات و اعتراضات بیان کیے ہیں اور ان کا جوابی حل طلب کیا ہے۔

فقہاء کی جانب آپ نے جو مسلک منسوب کیا ہے، اس میں گویا اس بات کو پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مضارب یا عامل اس معاملے میں بالکل آزاد ہے کہ وہ مضاربت میں صاحبِ سرمایہ کے مال میں اپنا کچھ مال بھی چاہے تو شامل کر دے اور اس میں اصل رب المال کی منظوری یا رضامندی لازم نہیں ہے۔ اسی مفروضے کی بناء پر آپ کے سارے سوالات مبنی ہیں۔

لیکن فقہائے کرام، بالخصوص فقہائے حنفیہ کے مسلک کی یہ ترجمانی یقیناً صحیح نہیں ہے۔ حنفی مسلک کی تفصیل اس بارے میں یہ ہے کہ عامل یا محنت کار صاحب سرمایہ کے اذن کے بغیر نہ اس کے سرمایہ کو اپنے مال میں خلط ملط کر سکتا ہے، نہ کسی دوسرے کے سپرد کر سکتا ہے اور نہ رب المال کے سرمایہ سے کسی تیسرے شخص کے ساتھ شرکت کر سکتا ہے۔ البتہ رب المال اگر مضارب کو اس طرح کے تصرفات کی خصوصی اجازت دیدے یا

یہ کہہ دے کہ تم اپنی رائے سے جس طرح چاہو اس کاروبار کو بڑھاؤ، تو ایسی صورت میں مضارب اپنا مال صاحب سرمایہ کے مال میں ملا سکتا ہے۔ اس طرح کی پیشگی اجازت کے بغیر اگر عامل اپنا روپیہ مضاربت والے مال میں شامل کرے گا یا کوئی دوسرا تصرف کرے گا، تو اس کا جواز فریق ثانی کی منظوری پر موقوف ہوگا۔ اگر وہ اسے قبول کرلے تو عامل کا یہ تجاوز صحیح قرار پائے گا، ورنہ ناجائز اور فاسد ہوگا۔ یہ مذاہب اربعہ کا متفق علیہ مسلک ہے۔

حضرات احناف نے مضارب پر مزید یہ پابندی بھی عائد کی ہے کہ وہ قرض دے کر یا لے کر مضاربت کے مال میں کمی بیشی نہ کرے اور کوئی دوسری ایسی کارروائی بھی نہ کرے جو بحیثیت مجموعی فریقین کے لیے یا کسی ایک فریق کے لیے موجب ضرر ہو یا جو مضاربت و تجارت کے معروفات کے خلاف ہو۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو غاصب ہوگا اور اس پر مناسب تاوان عائد ہوگا۔

اس تفصیل و تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مضارب اگر اپنے مال کا اضافہ کرنا چاہے، تو اس کے لیے دوسرے فریق کی رضامندی اور آمادگی لازم ہے۔ وہ اگر موزوں سمجھے گا تو اجازت دے گا، ورنہ نہیں دیگا۔ فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس اجازت کے بعد مضارب کے مال کا نفع مضارب ہی کو ملے گا اور کوئی معقول وجہ نہیں کہ اسی کو نہ ملے، جبکہ اپنے مال کی حد تک سرمایہ و محنت دونوں کا مالک وہ خود ہی ہے۔ اس کے خلاف آپ کے عائد کردہ اعتراضات و اشکالات میں کچھ وزن نہیں ہے۔ سرمایے میں اضافے سے منافع میں جو اضافہ بھی ہوتا ہے، اس میں فریقین کا سرمایہ مل جل کر کام کرتا ہے۔ اپنی اپنی مقدار کے مطابق ہر فریق کا سرمایہ نفع آور ثابت ہوتا ہے اور سرمایے کے تناسب سے نفع فریقین میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد زیادہ سرمائے والے کو محض سرمائے کی کثرت کے بل پر دوبارہ زائد نفع کا مستحق ٹھہرانا اور عامل کے نفع میں شریک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس طرح تو شراکت کی صورت میں بھی زیادہ سرمایہ لگانے والا یہ کہہ دیگا کہ میں چونکہ سرمائے کی مقدار کے لحاظ سے شریک غالب ہوں، اس لیے متناسب نفع سے زاید اور اس کے علاوہ مجھے دوسرے شریک کے نفع میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح نقصان کی صورت میں قلیل سرمایے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر میں تنہا کاروبار کرتا اور سرمایہ زیادہ نہ ہوتا تو نقصان بھی زیادہ نہ ہوتا، اس لیے مجھ پر خسارے کی ذمہ داری تناسب سے کم تر اور وافر سرمایے والے پر تناسب سے بیشتر ہونی چاہیے۔ غرض یہ کہ اس نرالے اور عجیب و غریب اصول سے ایسے نتائج برآمد ہوں گے جو بالکل غیر معقول اور مضحکہ خیز ہوں گے۔

وحیِ قرآنی کی حقیقت و ماہیت

سوال - ستمبر ۱۹۶۸ء کے ترجمان القرآن میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا اور اس سلسلے میں بعض دوسرے ناقدین کے مضامین بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر ہمیں اس بات پر کیوں اصرار ہے کہ وحی فرشتے کے ذریعہ ہی حضورؐ پر نازل ہوتی۔ دوسرے یہ بات بھی میرے نزدیک بعید از قیاس نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے مطالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو القا کیے اور ان مطالب کو الفاظ کا جامہ حضورؐ نے ہی پہنایا۔ یہ جو قرآن مجید میں اس کے نزول کے بارے میں آتا ہے کہ "قرآن کو روح الامینؑ آپ کے قلب پر لے کر نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں"، سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

میرے نزدیک یہ باتیں محض علمی اختلاف کی حیثیت رکھتی ہیں ان پر اتنا زیادہ زور نہ دینا چاہیے۔

جواب: (عبدالحمید صدیقی): میں آپ سے یہی گزارش کروں گا کہ آپ براہ کرم ایک مرتبہ پھر میری ان معروضات پر نگاہ ڈالیں جو میں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب کے بارے میں کی تھیں۔ آپ کا یہ ارشاد کہ یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے کسی لحاظ سے صحیح نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس انداز سے فرشتے کے ذریعۂ وحی ہونے کی نفی کی ہے اور جو لوگ اس کے قائل ہیں ان کی جس طرح سے انہوں نے تضحیک کی ہے اس سے ان کے ذہنی پس منظر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں وحی کی جو متعدد صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صورت یہ ہے کہ جبریل امینؑ نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اسی کو وحیِ متلو کا نام دیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ۔

اور یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ہاں یا تو وحی سے یا کسی آڑ سے یا کسی (فرشتہ) قاصد کو بھیج دے سو وہ وحی پہنچا دے اللہ کے حکم سے جو

(الشوریٰ - ۵۱) اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ بیشک وہ عالی شان ہے حکمت والا ہے۔

فرشتے کے آنے کی تفصیل احادیث کی قریب قریب ساری معتبر کتب میں ملتی ہے۔ جسے آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ ان واضح ارشادات کے ہوتے ہوئے معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اس کے انکار پر کیوں اصرار ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی دو ہی وجہیں ہیں ایک وہ جس کا انہوں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ وحی کے ساتھ فرشتے کا تصور معاذ اللہ رجعت پسندوں کی اختراع ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مفروضہ کو لے کر آگے بڑھے ہیں کہ جب اسے اختراع مان لیا جائے گا تو حدیث نبوی کی حیثیت دفتر بے معنی کی سی ہو جائے گی۔ دوسرے ان کا یہ باطل خیال ہے کہ وحی حضورؐ کی داخلی کیفیت کا ایک کرشمہ ہے۔ اسے اگر تسلیم کر لیا گیا تو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اور اس طرح اس کے الفاظ کی غیر معمولی عظمت اور تقدیس باقی نہ رہیگی۔

معلوم نہیں کہ آپ نے کس مصلحت کے تحت قرآن مجید کی واضح تصریحات کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر صاحب کے غلط موقف کو محض تعبیر کا اختلاف گردان کر اس کی سنگینی میں کمی کرنے کی کوشش کی ہے۔ باری تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں قرآن مجید کو کلام الٰہی فرمایا ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ - (التوبہ - ۶)

اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو آپ اس کو امن دے دیجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُنے۔

باری تعالیٰ نے قرآن مجید کو کلام الٰہی کہنے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اُس علام الغیوب نے اُن افترا پردازوں کی افترا پردازیوں کا بھی سدباب کر دیا ہے جو قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے لگتے ہیں۔ مالک الملک نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ قرآن مع الفاظ عربی اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انہی عربی الفاظ میں ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف - ۲)

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر - ۲۸)	قرآنِ عربی بغیر کسی کجی کے۔
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ (شوریٰ - ۷)	اور آپ پر اسی طرح یہ قرآن عربی میں وحی کیا گیا ہے۔

یہ چند آیات بطور مثال پیش کی گئی ہیں۔ قرآن مجید کی اور بہت سی آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ مطالب و معانی کے ساتھ قرآن مجید کے الفاظ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کیے گئے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نزولِ وحی کے وقت اپنی زبان فیض ترجمان کو جلدی جلدی حرکت نہ دو۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ	آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے۔ قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور اس کا پڑھانا تو ہمارا ذمّہ ہے۔

تو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن پڑھانا اور اُسے آپ کے سینۂ اقدس میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے۔ حضور خود اپنی وائی وحی الٰہی کو سن کر یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تاکہ کوئی لفظ یا شوشہ حافظے کی گرفت سے رہ نہ جائے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہو سکتی تھی کہ یہ اُن کا اپنا کلام نہ تھا جسکہ باری تعالیٰ نے اُن پر نازل فرمایا تھا۔ اگر ان حضرات کی بات کو مان لیا جائے کہ مطالب خدا کی طرف سے القا ہوتے تھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود انہیں الفاظ کا جامہ پہناتے تھے تو پھر یہ آیت تو بالکل بے معنی نظر آتی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لیے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُسے یاد رہ جائے۔

وجود باری تعالیٰ پر ایک قرآنی دلیل

سوال:۔ ہمارے ایک پروفیسر صاحب جماعت میں خداوند تعالیٰ کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں اور مختلف انداز میں اپنے طالبعلموں میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کا وجود معاذاللہ محض ایک واہمہ ہے۔ یہ کائنات خود بخود معرض وجود میں آگئی اور اب اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر چل رہی ہے۔ میرے چند ایک ساتھیوں کے ذہنوں میں اُن کے خیالات نے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ میں انہیں حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ براہ کرم وجود باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی ایسی دلیل دیں جو انہیں بالکل مطمئن کر سکے۔

جواب:۔ (عبدالحمید صدیقی) آپ کے پروفیسر صاحب کا ملحدانہ خیالات کا پرچار بڑا افسوسناک ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ حکومت کی غلط تعلیمی پالیسی کی وجہ سے ان حضرات کو اتنی جسارت ہونے لگی ہے کہ وہ علانیہ اپنے ان گمراہ کن نظریات کو نئی نسل کے اندر پھیلاتے رہتے ہیں۔ ہماری قوم کے سنجیدہ حلقوں کو اس کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیئے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں کوئی ایسی دلیل دوں جس سے آپ کے ساتھیوں کے ذہنوں سے شکوک و شبہات کے سارے کانٹے دور ہو جائیں تو اس سے میں عاجز ہوں۔ شکوک و شبہات کی وجہ لازمی طور پر معقول دلائل کا فقدان ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات ذہنوں کی کجی، ضد اور ہٹ بھی ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ اگر کوئی واضح دلیل دی جائے تو آپ کے رفقاء اسے قبول بھی کر لیں۔ اگر کسی بات کو تسلیم کر لینے کے لیے محض اس کا حق ہونا ضروری ہوتا تو پھر لوگ تعلیمات ربانی کو کبھی نہ جھٹلاتے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ حق کی موجودگی کے باوجود ٹیڑھے ذہن کے لوگ اُسے قبول نہیں کرتے۔

میرے نزدیک باری تعالیٰ کے وجود پر وہی دلیل سب سے زیادہ وزنی اور محکم ہے جسے قرآن مجید نے سورۃ ابراہیمؑ میں پیش فرمایا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ان کے رسولوں نے کہا کہ کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔

خالق کائنات۔ تو ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کے وجود کے متعلق اگر کوئی شک کرتا ہے تو وہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ خدا تو کائنات کی وہ سب سے بڑی سچائی ہے جو سورج سے زیادہ روشن اور واضح ہے۔

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے اندر جتنے احساسات پیدا ہوتے ہیں اُن کا بہرحال ایک نہ ایک محرک اور معروض ضرور ہوتا ہے۔ بھوک، خوف اور اسی نوعیت کی ساری جبلتیں اُن کے وجود پر ناقابل تردید شہادت فراہم کرتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی احساس اور جذبہ تو موجود ہو مگر اس کا کوئی محرک و معروض نہ ہو۔ جب خام انسانی احساسات کے لیے معروض کا وجود لازمی ہے تو آخر مذہبی احساس کو ایک واہمہ قرار دے کر کیوں نظرانداز کر دیا جائے؟ انسان خواہ کسی خیال اور مسلک کا ہو۔ خدا کا منکر ہو یا اس کا ماننے والا وہ بہرحال ان امور کے بارے میں ضرور سوچتا ہے کہ اس عالم مجاز سے ماوراء کیا ہے۔ اس کا آغاز کیسے ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا، کیا اس مادی زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ آپ ان مختلف سوالات کے جو جوابات دینا چاہیں دیں مگر ان سوالات کا آپ کے ذہن میں پیدا ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انسان عالم مجاز سے پرے اس حقیقت کبریٰ کا کھوج لگانے کے لیے بیتاب ہے، جس کے وجود کی وجہ سے اس کے دل میں یہ احساسات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان احساسات کی نوعیت کسی مابعد الطبیعیاتی ہستی کے وجود کی پرچھائیں کا پتہ دیتی ہے۔ جس چیز کا سرے سے کوئی وجود نہ ہو وہ آخر احساسات کی دنیا میں کیونکر کوئی جنبش پیدا کر سکتی ہے۔ اگر انسانی زندگی محض مادہ سے عبارت ہوتی اور اس کا وجود محض عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نتیجہ ہوتا، تو پھر انسان عالمِ مجاز سے ماوراء کے متعلق کبھی نہ سوچتا اور نہ کبھی اس کے ذہن میں ان امور کے بارے میں خیالات پیدا ہوتے۔ لیکن یہ خیالات اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس عالمِ مجاز سے ماوراء کوئی ایسی ذات موجود ہے جو مادّی زندگی کی حد بندیوں میں ہوتے ہوئے بھی انسان کو ماوراء کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ سوالات ہماری زندگی کے خمیر میں داخل ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ان کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے۔ جب یہ احساسات موجود ہیں۔ تو ان کے معروض کا وجود بھی بدیہی حقیقت ہے۔ آخر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ باقی احساسات کے معروضات

تو ہوں لیکن ان سب سے زیادہ موثر اور شدید احساس کا کوئی معروض نہ ہو؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید خالق کائنات کے بارے میں شک و شبہ کو بڑے استعجاب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس طرح انسان انسان کی حیثیت سے اپنی انسانیت سے دستبردار نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح اس کا خدا کے وجود سے انکار خلافِ عقل، خلافِ فطرت اور خلافِ بشریت ہے۔

قرآن مجید نے وجودِ باری تعالیٰ پر جو دوسرے دلائل دیے ہیں وہ بھی بڑے ٹھوس اور ناقابلِ تردید ہیں مگر افسوس کہ ان پر پوری طرح غور و خوض نہیں کیا جاتا۔

ادارہ مطبوعات طلبہ

کی

تازہ ترین پیشکش

By Abul Ala Maududi

- An analysis of the present day attitude of Muslims towards Islam
- A thought-provoking survey of the historical phases of Muslim Ummah during the last fourteen centuries

——and an answer to the question

IS ISLAM PRACTICABLE TODAY?

WITH 50 PAGE APPENDIX CAPTIONED

"INTRODUCING MAUDUDI"

By Misbahul Islam Faruqi

PP 132 - Price Rs. **3/75**

STUDENTS PUBLICATION BUREAU, 406/2, Garden West, Karachi-5